جہد سے عاری زندگی

کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ لوگ بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کی خوشیاں کیوں کھو بیٹھتے ہیں؟ اس وقت آپ میں بیشتر لوگ جو نوجوان ہیں، کافی خوش ہیں۔ ویسے آپ کے بھی کچھ مسائل ہیں۔ جیسے آپ کو امتحانات کی فکر ہے، لیکن ان مشکلات کے باوجود بھی آپ کی زندگی میں کچھ خوشی ہے، کیا نہیں ہے؟ کیونکہ آپ زندگی کو سادگی سے قبول کرتے ہیں، تمام چیزوں کو اس کی سادگی کے ساتھ دیکھتے ہیں لیکن ایسا کیوں ہے کہ جب ہم بڑے ہوتے ہیں تو آپ کو خوشی اور شادمانی کا وہ پیغام ملنا بند ہو جاتا ہے جو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں اور سے آتا ہے اور جس کی معنویت کہیں زیادہ بڑی ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہم میں سے بیشتر اس نام نہاد بلوغ کو حاصل ہونے کے ساتھ زندگی کی خوشی اور اس کے حسن کے لیے، اس کھلے آسمان اور حیرت انگیز زمین کے لیے بے حس اور لاپرواہ ہوتے چلے جاتے ہیں؟

جب کوئی خود اپنے سے اس طرح کا سوال پوچھتا ہے تو اس کے من میں کئی طرح کے خیالات آنے لگتے ہیں۔ ایک خیال تو یہ آسکتا ہے کہ ہم انتہائی خود مرکوز ہیں۔ ہم ’کچھ بننے،‘ ’کچھ پانے‘ اور ’اپنی عزت بنائے رکھنے‘ کے لیے متواتر جدوجہد کرتے رہتے ہیں؛ ہم پر

اپنے بال بچوں کی پرورش کی اور دیگر ذمہ داریاں ہیں، ہمیں پیسے بھی کمانا ہوتا ہے۔ یہ سب خارجی عوامل جلد ہی ہم پر حاوی ہو جاتے ہیں اور اس طرح ہم زندگی کی ساری خوشیاں کھو بیٹھتے ہیں۔ اگر آپ اپنے چاروں طرف کی ادھیڑ لوگوں کی صورت حال کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بیشتر کتنے دکھی ہیں، وہ کتنے فکرمند، کتنے بیمار، کتنے اداس، کتنے تنہا اور کبھی کبھی کتنے چڑچڑے اور منحوس بن جاتے ہیں۔ کیا آپ اپنے آپ سے کبھی اس کا سبب پوچھتے ہیں؟ اور آپ نے اگر اپنے آپ سے اس کا سبب کبھی پوچھا بھی تو پھر آپ میں سے بیشتر لوگ صرف تشریحات سے ہی مطمئن ہو جاتے ہیں۔

کل شام میں نے ایک کشتی کو ندی میں تیرتے ہوئے دیکھا، جو پچھوا ہواوں کے ساتھ پوری رفتار سے بہی جا رہی تھی۔ کشتی کافی بڑی تھی، جو جنگلی درختوں سے کاٹ کر لائی گئی لکڑیوں سے لدی ہوئی تھی۔ یہ لکڑیاں شہر میں جلائی جائیں گی۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور کھلے آسمان کے نیچے یہ کشتی حیرت انگیز طور پر حسین محسوس ہو رہی تھی۔ ملاح کا کام تو کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا، وہ تو صرف کشتی کو بس راستہ دکھا رہا تھا، کیونکہ ہوا خود ہی سارا کام کر دے رہی تھی۔ اسی طرح اگر ہم میں سے ہر ایک شخص اس جدوجہد اور دکھ کے مسئلے کو سمجھ لے تو میں سوچتا ہوں کہ ہم اپنے چہروں پر مسکراہٹ لیے ہوئے خوشی کے ساتھ، بغیر کوشش کے، جی سکنے کے اہل ہوں گے۔

میرا خیال ہے کہ ہماری یہ کوششیں اور جدوجہد ہی، جن میں ہم اپنی زندگی کا قریب قریب ہر لمحہ صرف کیے چلے جا رہے ہیں، ہماری تکلیف اور پریشانی کا سبب ہے۔ اگر آپ اپنے آس پاس کی ادھیڑ عمر کے لوگوں کا مشاہدہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بیشتر لوگوں کی پوری زندگی ہی تکلیف اور پریشانیوں کا ایک سلسلہ بن گئی ہے۔ خود اپنے آپ کے ساتھ، اپنی بیوی یا اپنے شوہر یا اپنے پڑوسی

کے ساتھ لڑائی جھگڑا کا ایک سلسلہ۔ اور بے روک ٹوک چلنے والا یہ سلسلہ آپ کی توانائی کو برباد کیے جا رہا ہے۔ وہ شخص جو خوش ہے، سچ مچ مسرور ہے، کوشش میں نہیں بندھتا ہے۔ کوشش اور محنت سے آزاد ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کچھ کریں ہی نہیں، لاپرواہ اور سست ہو جائیں، بلکہ اس کے برخلاف سچائی تو یہ ہے کہ جو سمجھ دار ہیں، جو عقل مند ہیں، صرف وہی شخص کوشش سے جد و جہد سے سچ مچ آزاد ہیں۔

لیکن جب ہم اس طرح سادہ مزاج ہونے کی، جہد سے عاری ہونے کی بات سنتے ہیں تو ہم اسی طرح جینے کی خواہش کرنے لگتے ہیں اور ایک ایسی حالت حاصل کرنا چاہتے ہیں جس میں نہ تو کوشش ہو اور نہ جد و جہد۔ اس طرح ہم ایک مقصد، ایک مثال، کھڑی کر لیتے ہیں اور اس کے لیے کوشش کرنے لگتے ہیں؛ اور جیسے ہی ہم اس کے لیے کوشش کرنا شروع کر دیتے ہیں، ہم زندگی کی خوشیاں کھو بیٹھتے ہیں۔ اس طرح ہم بار بار کوشش اور جد و جہد کے گھیرے میں پھنس جاتے ہیں۔ جد و جہد مقصد الگ الگ ہو سکتا ہے، لیکن تمام جد و جہد بنیادی طور سے ایک جیسے ہیں۔ کوئی سماج کی اصلاح کے لیے، تو کوئی حق کے حصول کے لیے تو کوئی اپنی بیوی یا اپنے شوہر یا اپنے پڑوسی کے ساتھ کے اپنے تعلقات کو سدھارنے کے لیے جد و جہد کر سکتا ہے یا کوئی گنگا کے کنارے بیٹھ سکتا ہے، یا کوئی گرو کے قدموں کی پوجا کر سکتا ہے، لیکن یہ سب کے سب جد و جہد ہے، کوشش ہے۔ اس لیے جد و جہد کا مقصد کیا ہے اس بات کی اہمیت نہیں، اہمیت تو اس بات کی ہے کہ ہم اس جد و جہد کو کیسے سمجھیں؟

جب ہم یہ دیکھیں کہ کیا ہمارے من کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اچانک کچھ لمحوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے اس جد و جہد سے، کوشش سے آزاد ہو جائے تا کہ یہ

مسرت کی ایسی صورت کا پتہ چل سکے جہاں بلند یا پست ہونے کا جذبہ ہی ختم ہو جائے۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمارا من خود کو کمتر محسوس کر لیتا ہے اور اسی لیے وہ 'کچھ ہونے' یا 'کچھ بننے' کے لیے جد و جہد کرتا ہے یا وہ اپنی ہی باہم مخالف خواہشات کے درمیان کی خلیج کو پاٹنے کا کوشش کرتا ہے۔ لیکن ہمیں ان اسباب کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارا من اس جد و جہد سے کیوں بھرا ہوا ہے؟ ہم میں سے ہر ایک شخص جو غور و فکر کرتا ہے، یہ جانتا ہے کہ ہم میں یہ داخلی اور خارجی تصادم کیوں ہے۔ ہمارا حسد، ہماری حرص، ہماری اولو العزمی اور دوسروں سے ہمارے موازنے جو ہمیں بے رحم اہلیت کی طرف لے جاتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ ہی وہ اسباب ہیں جو ہمیں تصادم پر مجبور کرتے ہیں۔ اس لیے یہ جاننے کے لیے کہ ہم تصادم میں کیوں مصروف ہیں، ہمیں نفسیات سے متعلق کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بے شک و شبہ اہم بات تو یہ ہے کہ ہم یہ تلاش کریں کہ کیا ہمارا من پوری طرح اس تصادم سے آزاد ہو سکتا ہے۔

دیکھا جائے تو ہماری ساری جد و جہد، کشمکش، 'ہم جو ہیں' اور 'ہم جو بننا چاہتے ہیں' یا 'ہمیں جیسا ہونا چاہیئے' کے درمیان ہی تو ہے۔ اب کیا کوئی اس تصادم کی پورے عمل کو بغیر تشریح کیے سمجھ سکتا ہے تا کہ یہ ختم ہو جائے؟ کیا ہمارا من بھی اس کشتی کی مانند، جو ہوا کے ساتھ ہی جا رہی ہے، تصادم سے آزاد اور سادہ ہو سکتا ہے؟ ہمارے سامنے یہی سوال ہے۔ یہ نہیں کہ ہم کس طرح اس تصادم سے عاری حالت کو حاصل کریں؟ کیونکہ ایسی حالت کو حاصل کرنے کی کوشش بھی تصادم کا ہی تو ایک عمل ہوا۔ اس لیے وہ حالت کبھی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اگر آپ لمحہ بہ لمحہ اس بات

کا مشاہدہ کریں کہ آپ کا من کس طرح بے روک ٹوک جدو جہد کیے چلا جا رہا ہے اور اگر آپ اس صورت حال کو، بغیر اس بدلنے یا اس پر اس صورت کو تھوپنے کے، جسے آپ امن کہتے ہیں، جہد سے عاری، سادگی کے جذبے سے صرف دیکھتے رہیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کا من اپنے آپ تصادم کی گرفت سے آزاد ہوتا جا رہا ہے اور یہی صورت حال ہے جب یہ خوب سیکھ سکتا ہے۔ تب سیکھنا اس کے لیے صرف معلومات کا ذخیرہ کرنا نہیں رہ جاتا ہے بلکہ یہ اس لامحدود کی تلاش کا ذریعہ بن جاتا ہے جو من کی حدود سے الگ ہے اور وہ من، جو اس کی تلاش کر لیتا ہے، مسرت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

آپ اپنا ہی مشاہدہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ صبح سے رات تک کس طرح جدو جہد کرتے رہتے ہیں اور کس طرح آپ کی توانائی اس جدو جہد میں ضائع ہوتی رہتی ہے۔ اگر آپ اپنی جدو جہد کے اسباب کی صرف تشریح کرتے ہیں تو آپ ان تشریحات میں گمراہ ہو جائیں گے اور یہ جدو جہد جاری رہے گی۔ اس کے برخلاف اگر آپ تشریح نہ کرکے ایک دم خاموشی سے اپنے من کا مشاہدہ کریں، اگر آپ اپنے من کو اس کے تصادمات کے لیے بیدار رہنے دیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک ایسی صورت حال کی آمد ہو رہی ہے جس میں تصادم ہے ہی نہیں، بلکہ صرف حیران کر دینے والی بیداری ہے۔ اس بیدار حالت میں بلند و پست کا جذبہ ہی نہیں رہ گیا ہے، تب نہ تو کوئی بڑا ہے اور نہ کوئی چھوٹا ہے اور نہ کوئی گرو ہے۔ تب چونکہ ہمارا من پوری طرح پرسکون اور بیدار ہو جاتا ہے، اس لیے یہ تمام حماقتیں غائب ہو جاتی ہیں اور من جب پوری طرح بیدار ہوتا ہے، وہ مسرور ہوتا ہے۔

*****

سوالی: میں کوئی کام کرنا چاہتا ہوں، لیکن کئی بار کوشش کرنے کے باوجود بھی میں اس میں کامیاب نہیں ہو پایا ہوں۔ اب کیا میں ساری کوششیں بند کر دوں یا جاری رکھوں؟

کرشن مورتی: کامیاب ہونے کا مطلب ہے کہیں پہنچنا، کچھ حاصل کرنا۔ اور ہم کامیابی کی پوجا کرتے ہیں، نہیں کرتے ہیں کیا؟ جب ایک غریب لڑکا بڑا ہونے پر کروڑپتی بن جاتا ہے یا ایک معمولی انسان جب وزیر اعظم بن جاتا ہے تو اس کی واہ واہی ہوتی ہے، اس کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر لڑکے یا لڑکی کو کسی نہ کسی شکل میں کامیابی کی تمنا رہتی ہے۔

دیکھنا چاہیے کہ اصل میں کامیابی نام کی کوئی چیز ہے بھی یا یہ صرف ایک خیال ہے جس کے پیچھے انسان بھاگتا پھرتا ہے؟ کیونکہ جس لمحے آپ کہیں پہنچ جاتے ہیں، اسی لمحے وہاں سے آگے ایک منزل دکھائی دیتی ہے جہاں پہنچنا ابھی باقی ہے۔ جہاں تک آپ کامیابی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، پھر چاہے وہ کامیابی کسی بھی سمت میں کیوں نہ ہو، وہاں تک یہ لازمی ہے کہ ہم تناؤ میں رہیں گے، تصادم میں رہیں گے، نہیں کیا؟ یہاں تک کہ جب آپ کہیں پہنچ بھی جاتے ہیں تو بھی آپ کو آرام نہیں مل پاتا؛ کیونکہ تب آپ کچھ اور اوپر جانا چاہتے ہیں، کچھ اور زیادہ پانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ میری بات سمجھ رہے ہیں؟ کامیابی کی تمنا کرنے کا مطلب ہے 'زیادہ' کی خواہش کرنا اور وہ من، جو مسلسل 'زیادہ' کی خواہش کر رہا ہے، ذہین نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایسا من بے رس اور ناسمجھ من ہے؛ کیونکہ اس کی زیادہ کی مانگ میں ہی مسلسل جدو جہد پوشیدہ ہے جو ایک طرح سے سماج کے ذریعے تعمیر کردہ سانچے کی نقل کرنے کی کوشش ہے۔

آخر یہ اطمینان کیا ہے؟ اور یہ عدم اطمینان کیا ہے؟ عدم اطمینان کا

مطلب ہے، 'زیادہ' کے لیے جد و جہد، اور اطمینان کا مطلب ہے، اس جد و جہد کا خاتمہ۔لیکن جب تک آپ اس 'زیادہ' کے پورے عمل کو نہیں سمجھ لیتے اور یہ نہیں معلوم کر لیتے کہ من اسے کیوں چاہتا ہے، تب تک آپ اطمینان نہیں حاصل کر سکتے ہیں۔

فرض کیجیے کہ آپ امتحان میں ناکام ہو گئے ہیں تو آپ پھر سے امتحان دیتے ہیں، کیا نہیں دیتے؟ امتحانات ہر حال میں نہایت بدبختانہ ہیں کیونکہ یہ کسی اہم چیز کا اشارہ نہیں دیتے اور نہ ہی یہ آپ کی حقیقی ذہانت کو واضح کرتے ہیں۔امتحان میں کامیاب ہو جانا عام طور پر ہماری یادداشت کا کرشمہ ہے اور یہ اتفاق پر مبنی ہے۔لیکن آپ تو امتحانات پاس کرنا ہی چاہتے ہیں اور اگر آپ ناکام بھی ہو گئے تو بار بار کوشش کرتے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر لوگوں کی روزمرہ کی زندگی میں بھی یہی عمل چلتا رہتا ہے۔ہم تو بس کسی چیز کے لیے جد و جہد کیے جا رہے ہیں، اور ہم کبھی لمحہ بھر رک کر یہ تفتیش بھی نہیں کرتے کہ کیا وہ چیز جد و جہد کے لائق ہے؟ ہم تو بس اپنے والدین، اپنے سماج، اپنے تمام پیغمبروں اور گروؤں کی روایات پکڑ کر بیٹھے ہیں۔ 'کامیابی' اور 'ناکامی' کے نام دینا ہم سے اسی وقت بند ہو سکے گا جب کہ ہم اس 'زیادہ' کے پورے مطلب کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ہم ناکام ہونے سے، غلطیاں کرنے سے، امتحانات میں ہی نہیں بلکہ عملی زندگی میں بھی کتنے خوف زدہ ہیں۔غلطی کرنا، بہت برا مانا جاتا ہے، کیونکہ اس سے انسان ہماری تنقید کرتے ہیں، لوگ ہمیں جھڑکتے ہیں۔لیکن آخر آپ غلطیاں کیوں نہیں کریں؟ کیا دنیا کے سارے لوگ غلطیاں نہیں کر رہے ہیں؟ اور اگر آپ غلطیاں نہیں بھی کریں تو کیا یہ دنیا اس خوفناک صورت حال سے

آزاد ہو جائے گی؟ اگر آپ غلطیاں کرنے سے خوف زدہ ہیں تو آپ کبھی نہیں سیکھ سکتے۔ بڑے لوگ ہر وقت غلطیاں کیے جا رہے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں چاہتے کہ آپ غلطیاں کریں؛ وہ اس طرح آپ کی فطری توانائی کو نقصان پہنچا دیتے ہیں۔لیکن کیوں؟ اس لیے کہ انھیں اس بات کا خوف ہے کہ کہیں آپ ہر چیز کا تجزیہ کر کے، مشاہدہ کر کے، شک کر کے اور غلطیاں کر کے اپنے لیے کسی ایسی چیز کی تلاش نہ کر لیں کہ جس سے آپ والدین، سماج اور روایت کے حقوق ترک کر دیں۔ یہی سبب ہے کہ آپ کے سامنے ہمیشہ کامیابی کی مثال رکھی جاتی ہے تا کہ آپ اس کی تقلید کرتے رہیں۔آپ کو یہ محسوس ہوا ہو گا کہ 'کامیابی' عزت کا ہی دوسرا نام ہے۔ یہاں تک کہ ایک سنیاسی کے لیے بھی اس نام نہاد روحانی حصول میں 'باعزت' ہونا ضروری ہے، ورنہ اسے کوئی تسلیم نہیں کرے گا، لوگ اس کے شاگرد نہیں بنیں گے۔

اس لیے ہم ہمیشہ کامیابی کے نقطہ نظر سے 'زیادہ' کے نقطہ نظر سے سوچتے ہیں اور اس 'زیادہ' کو سماج کے ذریعے پرکھ کر اس کی قدر کا تعین کیا جاتا ہے۔بہ الفاظ دیگر سماج نے بڑی ہوشیاری سے کچھ کسوٹیاں قائم کی ہیں، جن کے مطابق آپ 'کامیاب' یا 'ناکام' قرار دیے جاتے ہیں۔لیکن اگر آپ کوئی کام محبت سے اور اپنی پوری صلاحیت سے کرتے ہیں تو آپ کو کامیابی اور ناکامی سے مطلب ہی نہیں رہتا۔ کسی بھی ذکی انسان کو اس سے مطلب نہیں ہو گا۔لیکن بدقسمتی سے۔بہت تھوڑے ہی لوگ ذکی ہیں اور آپ سے ان تمام باتوں کے بارے میں کوئی نہیں کہتا۔ذکی انسان کا یہ انتہائی اہم کام ہے کہ وہ سچائی کو دیکھے اور مسئلے کو سمجھے، کامیابی یا ناکامی کے نقطہ نظر سے نہیں۔ہم اس کامیابی ناکامی کے چکر میں اسی وقت پھنستے ہیں جب ہمیں اپنے کام سے سچ مچ

محبت نہیں ہوتی۔

سوال: ہم بنیادی طور پر خودغرض کیوں ہیں؟ ہم اپنے برتاؤ میں خودغرضی سے بچنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں لیکن جب ہمارے اپنے فائدے نقصان کا سوال درمیان میں آ کھڑا ہوتا ہے تو ہم خود مرکوز اور دوسروں کے لیے لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔

کرشن مورتی: میرا خیال ہے کہ کوئی اپنے آپ کو 'خودغرض' یا 'بے غرض' کا نام نہ دے، یہ انتہائی اہم ہے کیونکہ من پر ان الفاظ کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔ آپ کسی کو 'خودغرض' کہیے گا تو وہ بہت دکھی ہو جائے گا۔ کسی کو 'پروفیسر' کہیے اور آپ دیکھیں گے کہ آپ کا اس سے ملنا خصوصی ہو جائے گا؛ کسی کو مہاتما کہیے تو اس کے چاروں طرف روشنی کا ہالہ بن جائے گا۔ اگر آپ خود 'وکیل'، 'تاجر'، 'گورنر'، 'نوکر'، 'خدا' وغیرہ الفاظ کے لیے اپنے ہی ردعمل کا مشاہدہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کی رگیں اور آپ کا من ان سے کتنا متاثر ہوتا ہے۔ ایسے الفاظ جو کسی شخص کے کام کو ظاہر کرتے ہیں وہ اکثر ان کے عہدے اور مرتبے کا احساس دیتے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم الفاظ کے ساتھ اپنے جذبات کو وابستہ کرکے لاشعور کی اس عادت سے آزاد ہوں۔ آپ کا من اس طرح سوچنے کا عادی ہو گیا ہے کہ 'خودغرض' لفظ کتنا برا ہے، غیر روحانی ہے، اور جس لمحے آپ اس صفت کا استعمال کرتے ہیں اسی لمحے اس شخص کے لیے جس کے لیے آپ اس لفظ کا استعمال کر رہے ہیں آپ کا من برائی سے بھر جاتا ہے۔ اس لیے جب آپ یہ سوال پوچھتے ہیں، 'ہم بنیادی طور سے خودغرض کیوں ہیں'؟ تو اس میں پہلے ہی سے برائی کا جذبہ داخل ہو چکا ہے۔

اس بات سے ہوشیار رہنا انتہائی اہم ہے کہ کچھ الفاظ ہم میں جذباتی یا ذہنی طور پر قبولیت یا ردعمل پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جیسے ہی آپ خود کو 'حاسد' کہہ دیتے ہیں آپ آگے کی تلاش بند کر دیتے ہیں۔ اس طرح آپ حسد کے پورے عمل میں داخل

ہو کر سمجھنا بھی بند کر دیتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں ایسے کئی لوگ ہیں جو یہ کہا کرتے ہیں کہ وہ بھائی چارے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ پھر بھی ان کے ذریعے کیا گیا ہر کام اس بھائی چارے کے جذبے کے ایک دم خلاف ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس سچ کو نہیں دیکھتے۔ کیونکہ بھائی چارے کا انھوں نے ایک مخصوص مطلب سمجھ رکھا ہے اور وہ بس اسی کو سامنے رکھتے ہیں۔ وہ اس کے آگے کوئی کھوج کرنا نہیں چاہتے اور اسی لیے وہ صرف ان لفظوں کے ذریعے پیدا کیے گئے جذباتی ردعمل کو ہی جان پاتے ہیں۔ وہ کبھی لفظوں کے سچ کو تلاش نہیں کر پاتے۔

اس لیے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم کچھ لفظوں کے ساتھ وابستہ تعریف اور برائی کے جذبے کے بغیر حقائق کا تجزیہ کریں، انھیں جانیں۔ اگر آپ حقائق کو برائی یا تعریف کے بغیر دیکھ سکیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس تجزیے کے عمل میں ہی تمام دیواریں منہدم ہو جاتی ہیں، جن کی تعمیر من نے حقائق اور آپ کے درمیان کی تھی۔

ذرا آپ اس پر دھیان دے کر دیکھیں کہ آپ ایک ایسے شخص سے کس طرح ملتے ہیں جسے لوگ 'عظیم' یا بڑا آدمی کہتے ہیں۔ 'عظیم شخص' لفظ نے آپ کو متاثر کر رکھا ہے۔ اخبارات، کتابیں، اور اس کو چاہنے والے سبھی کہتے ہیں کہ وہ ایک عظیم انسان ہے اور آپ کے من نے یہ قبول کر لیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ٹھیک اس کے خلاف اپنی رائے بنا لیں اور کہنے لگیں، 'وہ کتنا بیوقوف ہے'، 'وہ قطعی عظیم نہیں ہے'۔ اور اگر آپ اپنے من کو ان تمام اثرات سے آزاد کر لیں، سادگی سے سچ کو دیکھیں، تو آپ محسوس کریں گے کہ کسی شخص سے آپ کا ملنا بالکل ہی مختلف قسم کا ہو جائے گا۔ اسی طرح 'گنوار' لفظ بھی غریبی، گندگی، میلا پن وغیرہ کے جذبات سے پر ہے

اور وہ آپ کو متاثر کرتا ہے؛ لیکن ہمارا من جب ان اثرات سے آزاد ہو جاتا ہے، جب یہ نہ تو برائی کرتا ہے اور نہ تعریف، لیکن صرف دیکھتا ہے، مشاہدہ کرتا ہے، تب وہ خود مرکوز نہیں رہ جاتا اور وہاں خود غرض یا بے غرض بننے کا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہ جاتا۔

سوالی: ایسا کیوں ہوتا ہے کہ انسان پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک ہمیشہ محبت چاہتا ہے اور اگر اسے یہ محبت نہیں ملتی ہے تو اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح اس کا من توازن اور خود اعتمادی محسوس نہیں کر پاتا ہے؟

کرشن مورتی: کیا آپ سوچتے ہیں کہ اس کے ساتھی خود اعتمادی سے بھرے ہوے ہیں؟ بھلے ہی وہ اکڑ کر چلتے ہوں، بیجا فخر میں مبتلا ہوں، لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس خود اعتمادی کے دکھاوے کے پیچھے بیشتر لوگ خالی ہوتے ہیں، لاپرواہ ہیں، سست ہیں، ان میں اعتماد ہے ہی نہیں۔ اور ہم یہ چاہتے ہی کیوں ہیں کہ لوگ ہمیں محبت کریں؟ اور اگر آپ بڑے ہیں تو پھر آپ اپنی بیوی یا اپنے شوہر یا گرو سے محبت چاہتے ہیں۔ ہم میں یہ کبھی نہ ختم ہونے والی محبت کی لالچ ہی کیوں ہے؟ مہربانی کرکے آپ میری بات احتیاط سے سنیں۔ آپ محبت محض اس لیے چاہتے ہیں کہ آپ خود محبت نہیں کرتے ہیں؛ لیکن جس لمحے آپ محبت کرنے لگتے ہیں یہ مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ تب آپ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ کوئی آپ کو محبت کر رہا ہے یا نہیں۔ جب تک آپ محبت کی مانگ کرتے ہیں، تب تک آپ میں ہی محبت نہیں ہوتی اور اگر آپ خود محبت کو محسوس نہیں کرتے ہیں تو آپ بدہیئت ہیں، سخت ہیں، بے رحم ہیں، پھر کیوں کوئی آپ سے محبت کرے؟ بغیر محبت کے آپ ایک مردہ چیز ہیں اور ایک مردہ چیز بھلے ہی محبت کی امید کرے لیکن پھر بھی وہ مردہ ہی رہے گی۔ اس کے برعکس اگر آپ کا دل محبت سے لبریز ہے تو

آپ کبھی بھی محبت کے لیے بھیک نہیں مانگتے، تب آپ محبت کے لیے اپنا ہاتھ کسی اور کے سامنے نہیں پھیلاتے۔ جو دل خالی خالی ہوتا ہے وہی خود کو بھرنا چاہتا ہے لیکن ایک خالی دل ہمیشہ خالی ہی بنا رہے گا، بھلے ہی وہ گروؤں کی طرف بھاگتا پھرے یا دیگر سینکڑوں طریقوں سے محبت کی تلاش کرتا رہے۔

سوالی: بڑے چوری کیوں کرتے ہیں؟

کرشن مورتی: کیا آپ کبھی کبھار چوری نہیں کرتے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ ایک چھوٹا بچہ اس چیز کو، جس کی اسے ضرورت ہوتی ہے، دوسرے سے چرا لیا کرتا ہے؟ ٹھیک اسی طرح ہم زندگی بھر کیا کرتے ہیں، پھر چاہے ہم چھوٹے ہوں یا بڑے۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ بڑے یہ زیادہ ہوشیاری سے اور اسے زیادہ باعزت لفظ دے کر کرتے ہیں۔ وہ بھی دولت، قوت اور عزت چاہتے ہیں اور اسے پانے کے لیے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ طریقے ایجاد کرتے ہیں، اصول گڑھتے ہیں۔ وہ بھی چوری کرتے ہیں لیکن وہ اسے چوری نہیں کہتے، اسے وہ کوئی عزت دار لفظ دیتے ہیں۔ اب سوال ہے کہ ہم چوری کیوں کرتے ہیں؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ چونکہ سارے سماج کی تشکیل ہی اس طرح کی ہے کہ بے شمار لوگ زندگی کی ضروریات سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وہ پورا اناج، پورا کپڑا اور رہائش کے لیے گھر حاصل نہیں کر پاتے ہیں۔ اسی لیے ایسے لوگ کچھ چوری کر لیا کرتے ہیں۔ سماج میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس لیے نہیں چراتے ہیں کہ انھیں بھر پیٹ کھانے کو نہیں ملتا، بلکہ اس لیے کہ وہ سماج مخالف ہیں، جیسا کہ انھیں کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے چوری ایک کھیل ہے، ایک جوش ہے، جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ انھیں صحیح تعلیم نہیں ملی ہے۔ صحیح تعلیم و تربیت کا مطلب زندگی کی اہمیت کو سمجھنا ہے، صرف امتحان پاس کرنا

نہیں۔ ایک اونچی سطح کی بھی چوری ہوتی ہے، اور وہ ہے دوسرے انسان کے خیالات کی چوری، علم کی چوری؛ اور جب ہم کسی بھی شکل میں 'زیادہ' کی خواہش رکھتے ہیں تو بھی ہم واضح طور پر چوری ہی کر رہے ہوتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے کہ ہمیشہ مانگتے ہیں، ہاتھ پھیلاتے ہیں، چوری کرتے ہیں، تمنائیں رکھتے ہیں؟ صرف اسی لیے کہ ہم خود خالی ہیں، ہم نفسیاتی طور پر اپنے داخلی دنیا میں بالکل خالی ڈھول کی طرح ہیں؛ چونکہ ہم خود خالی ہیں اس لیے ہم اپنے آپ کو بھرنے کے لیے صرف چوری ہی نہیں کرتے، بلکہ دوسروں کی نقل بھی کرتے ہیں۔ نقل بھی ایک طرح کی چوری ہی ہے۔ آپ خود 'کچھ نہیں' ہیں، لیکن فلاں 'کچھ' ہے۔ اس لیے آپ اس کی تقلید کر کے اس کی چمک کا کچھ حصہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ غلط کام ہماری ساری زندگی پر بسیط ہے اور ہم میں سے بہت ہی کم اس سے آزاد ہو پاتے ہیں۔ اس لیے اہم بات یہ ہے کہ کیا اس داخلی خالی پن کو کبھی بھرا جا سکتا ہے؟ جہاں تک ہمارا من اسے بھرنے کی کوشش کرتا رہے گا وہاں تک یہ ہمیشہ خالی ہی بنا رہے گا۔ جب ہمارا من اپنے خالی پن کو بھرنے کے ساری کوششیں چھوڑ دے گا، تبھی یہ منتشر ہو سکے گا۔

من ہی سب کچھ نہیں ہے

آپ کو معلوم ہے، ایک دم خاموش ہونا، توازن کے ساتھ سیدھے بیٹھنا کتنا خوب صورت ہے۔ اور یہ اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ پتیوں سے عاری اِن درختوں کا مشاہدہ کرنا۔ کیا آپ نے علی الصبح سنہرے نیلے آسمان کے سامنے کھڑے ان خوب صورت درختوں کو کبھی دیکھا ہے؟ تمام عریاں شاخیں درخت کے حسن کو ظاہر کر رہی ہوتی ہیں؛ اور درختوں کا حسن بھی حیرت انگیز ہوتا ہے۔ پھر چاہے بہار ہو، سردی ہو یا گرمی ہو۔ اور اس حسن کو دیکھنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اپنی زندگی کی سرگرمیوں پر غور کرنا۔

ہم چاہے روس میں رہیں، چاہے امریکہ میں رہیں چاہے بھارت میں، لیکن ہم سبھی انسان ہیں اور انسان ہونے کے ناطے ہمارے مسائل یکساں ہیں۔ اس لیے ہندو، امریکی، روسی، چینی یا کسی اور شکل میں اپنے بارے میں سوچنا کتنا مضحک ہے۔ دنیا سیاسی، جغرافیائی، ذات برادری اور معاشی بنیادوں پر تقسیم ہے، لیکن اس تقسیم پر زور دے کر ہم صرف باہم مخالفت اور نفرت ہی پیدا کرتے ہیں۔ فی الحال امریکی بھلے ہی زیادہ خودمختار ہوں، ان کے پاس زیادہ تڑک بھڑک کے سامان ہوں، زیادہ ریڈیو اور زیادہ ٹیلی ویژن ہوں، ان

کے پاس ضرورت سے زیادہ اناج ہو، ہر چیز کی بہتات ہو، اور اس ملک میں انتہائی درجے کا قحط ہو، گندگی ہو، گھنی آبادی ہو، بے روزگاری ہو، لیکن ہم کہیں کے بھی رہنے والے کیوں نہ ہوں، ہم سبھی انسان ہیں اور انسان ہونے کے ناطے ہم سبھی اپنے انسانی مسائل کی تخلیق کرتے ہیں۔ اس لیے یہ سمجھ لینا نہایت اہم ہے کہ ایک ہندو، امریکی یا انگریز یا گورے، گیہویں، کالے یا پیلے انسان کی حیثیت سے غور و فکر کر کے ہم اپنے درمیان غیر ضروری خلیجوں کی تعمیر کرتے رہتے ہیں۔

ہماری خاص مشکلات میں سے ایک مشکل یہ ہے کہ ساری دنیا میں جدید تعلیم کا مقصد ہمیں صرف مشین بنا دینا محض رہ گیا ہے۔ ہمیں سکھایا جاتا ہے کہ ہم کس طرح جیٹ بنائیں، کیسے ہم سہولت بخش سڑکوں کی تعمیر کریں، کیسے موٹر بنائیں، کس طرح سمندر میں داخل کرنے والی ایٹمی پن ڈبیوں کا نظام بنائیں اور اس ساری مشینیت کے عمل میں ہم یہ تو بھول ہی جاتے ہیں کہ ہم انسان بھی ہیں؛ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنے دل کو من کی ساری غیر ضروری چیزوں سے بھرے جا رہے ہیں۔ امریکہ میں خودکار مشینوں کی وجہ سے بیشتر لوگ کام سے دور ہوتے جا رہے ہیں، جیسا کہ اس ملک میں بھی ہونے والا ہے، اور تب ہم لوگوں کے سامنے یہ سنجیدہ مسئلہ کھڑا ہو گا کہ ہم کس طرح اپنے فرصت کے اوقات کا استعمال کریں۔ آج جن بھاری صنعتوں میں ہزاروں لوگ کام کر رہے ہیں، مستقبل میں وہ کام کچھ تکنیکی لوگوں کے ذریعے ہی پورا کر لیا جائے گا۔ اور تب ان لوگوں کا کیا ہو گا جو وہاں پہلے کام کرتے تھے اور اب جن کے پاس بہت زیادہ وقت ہو گا؟ اس لیے تعلیم جب تک اس جانب اور اسی طرح کے دیگر انسانی مسائل کی طرف دھیان نہیں دیتی تو ہماری زندگی کھوکھلی ہی بنی رہے گی۔

آج ہماری زندگی بہت زیادہ خالی خالی سی ہے۔ آپ کے پاس بھلے ہی کالج

کی ڈگری ہو، بھلے ہی آپ شادی کر لیں اور دولت مند بن جائیں، بھلے ہی آپ نہایت ہوشیار ہوں اور آپ دنیا بھر کی معلومات جمع کر لیں، چاہے آپ جدید ترین کتابیں پڑھ لیں، لیکن جہاں تک آپ دل کو ان چیزوں سے بھرتے رہیں گے وہاں تک یہ طے ہے کہ آپ کی زندگی خالی ہی رہے گی، بدصورت ہی رہے گی، اس کا کوئی مطلب ہی نہیں رہے گا۔ زندگی میں حسن اور معنی تو تبھی پیدا ہو سکتے ہیں جب ہمارا دل ان تمام چیزوں سے دور ہو گیا ہو۔

یہ ہم میں سے ہر ایک کا ذاتی مسئلہ ہے۔ آپ اسے کوئی ایسا تصوراتی مسئلہ نہ سمجھ لیں جس کا ہم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اگر ہم انسان ہونے کے ناطے اس زمین کی جانب، اس میں موجود چیزوں کی جانب دھیان نہیں دیتے، اگر ہم اس کے بچوں سے محبت نہیں کرتے اور ہم صرف اپنی اور اپنے ملک کی ترقی اور کامیابی کے بارے میں ہی سوچا کرتے ہیں، تب ہم اپنی دنیا کو بھیانک بنا دیں گے جیسا کہ ہم پہلے سے ہی بناتے چلے آ رہے ہیں۔ بھلے ہی ایک ملک نہایت دولت مند ہو جائے لیکن اس کی خوش حالی اس وقت تک زہر بنی رہے گی جب تک کہ کوئی دوسرا ملک بھوکوں مر رہا ہے۔ ہم سب ایک ہی انسانی خاندان ہیں اور یہ زمین ہماری سب کی ہے۔ ہماری شفقت آمیز پرورش سے، پیار محبت سے دیکھ بھال کرنے پر یہ زمین ہم سبھی کے لیے کھانا، کپڑا اور مکان کا انتظام کرے گی۔

اس لیے تعلیم کا مقصد محض آپ کو کچھ امتحانات پاس کروا دینا نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کی ساری سرگرمیوں کو سمجھنے میں، جس میں شہوت، روزی روٹی کا حصول، ہنسی خوشی، پہل، ہمدردی، سنجیدہ غور و فکر وغیرہ سب شامل ہیں، آپ کی مدد کرنا ہے۔ خدا کیا ہے، یہ تلاش کرنا بھی ہمارا ایک مسئلہ ہے، کیونکہ یہ ہماری زندگی کی بنیاد ہے۔ مضبوط بنیاد کے فقدان میں کوئی مکان زیادہ دنوں تک کھڑا نہیں رہ سکتا اور

اگر ہم خدا کا حق کی تلاش نہیں کر رہے ہیں تو انسان کی تمام دانش مندانہ ایجادات فضول ہیں۔

آپ یہ ساری باتیں سمجھ سکیں اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کے اساتذہ اس کام میں آپ کی مدد کرنے کے اہل ہوں، کیونکہ آپ کو بچپن سے ہی یہ تلاش شروع کر دینی ہوگی، نہ کہ تب جب آپ ساٹھ برس کے ہو چکے ہوں۔ آپ ساٹھ سال کی عمر میں خدا کو بالکل نہیں تلاش کر سکتے، کیونکہ اس وقت تک بیشتر لوگ تھک چکے ہوتے ہیں، ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔ آپ اپنی چھوٹی عمر میں ہی یہ تلاش شروع کر دیں، کیونکہ تبھی آپ مناسب بنیاد کی تعمیر کر سکیں گے اور پھر آپ کا مکان ان تمام آندھیوں میں کھڑا رہ سکے گا جو انسانوں کے ذریعے خود ہی پیدا کی گئی ہے۔ آپ خوشی سے اسی وقت رہ سکیں گے، کیونکہ اس وقت آپ کی خوشی کسی چیز پر منحصر نہیں ہوگی، تب یہ ساڑیوں، جواہرات، موٹروں اور ریڈیو پر منحصر نہیں ہوگا۔ تب یہ اس بات پر بھی منحصر نہیں رہے گا کہ کوئی شخص آپ سے محبت کرتا ہے یا آپ کو رد کرتا ہے۔ تب آپ اس لیے خوش نہیں ہوتے ہیں کہ آپ کے پاس کوئی چیز ہے، عہدہ ہے، یا دولت ہے، یا علم ہے بلکہ اس لیے کہ آپ کی زندگی خود میں بامعنی ہے۔ آپ زندگی کے اس معنی کی تلاش تو تبھی کر سکیں گے جب آپ لمحہ بہ لمحہ حق کی تلاش کریں گے؛ اور حق ہر چیز میں موجود ہے۔ اسے آپ کسی چرچ، کسی مندر، کسی مسجد یا کسی عبادت و ریاضت میں نہیں تلاش کر سکتے۔

حق کی تلاش کے لیے ہمیں یہ ضروری جاننا ہوگا کہ ہم اس دھول کو، جو صدیوں سے اس پر جمی ہوئی ہے، کس طرح پونچھ سکیں، اور، مجھ پر بھروسا کیجیے، حق کی تلاش ہی حقیقی تعلیم ہے۔ کوئی بھی ہوشیار انسان کچھ کتابیں پڑھ کر معلومات کا ذخیرہ کر سکتا ہے اور پھر

کوئی عہدہ حاصل کر کے دوسرے کا استحصال بھی کر سکتا ہے، لیکن وہ تعلیم نہیں ہے۔ کچھ موضوعات کا مطالعہ کر لینا تعلیم کا صرف ایک چھوٹا سے حصہ ہے، لیکن ہماری زندگی بہت وسیع و عریض ہے اور ہمیں اس سمجھنے کے لیے تعلیم یافتہ کیا ہی نہیں جاتا، نہ ہی اس سمجھنے کا ہمارے پاس کوئی صحیح نظریہ موجود ہے۔

یہ معلوم کرنا کہ ہم زندگی کا سامنا کیسے کریں تاکہ ہماری روزمرہ کی زندگی اور اس میں کام آنے والی چیزیں جیسے ریڈیو، موٹر کار، ہوائی جہاز، ان سب کی معنویت ایک ایسی چیز سے وابستہ ہو جائے جو ان سب کو شامل کرتے ہوئے بھی ان سے سے الگ ہو۔ یہ پتہ لگانا ہی تعلیم ہے۔ دوسرے الفاظ میں تعلیم کی ابتدا لازمی طور سے مذہب سے ہو۔ لیکن مذہب کا تعلق کسی پنڈت پادری، کسی مندر، کسی عقیدے یا کسی یقین سے نہیں ہے۔ مذہب کا مطلب ہے بے لوث محبت کرنا، کھلا دل و دماغ رکھنا، نیک اور نرم دل ہونا کیونکہ ہم صرف اسی وقت سچے انسان ہوتے ہیں، لیکن حق کی تلاش کے بغیر نیکی اور محبت کی آمد نہیں ہو سکتی۔

بدقسمتی سے ہماری زندگی کا یہ اہم ترین میدان ہی آج اس نام نہاد تعلیم میں نظر انداز ہو رہا ہے۔ آپ یا تو مسلسل کتابوں میں الجھے رہتے ہیں یا امتحان پاس کرنے میں، جن کا حقیقت میں کوئی بھی خاص مطلب نہیں ہے۔ امتحانات آپ کو کوئی کاروبار دلا سکتے ہیں اور اسی لیے ان تھوڑا مطلب ہے؛ لیکن مستقبل میں کتنے ہی کارخانے قریب قریب پوری طرح مشینوں سے چلائے جائیں گے اور اسی لیے ہمیں ابھی سے ہی اپنے فرصت کے اوقات کا صحیح استعمال کرنے کے لیے تعلیم یافتہ کیا جانا چاہیے۔ مثالوں کو پیچھے بھاگنے کے لیے نہیں، بلکہ ہمیں تعلیم یافتہ کیا جائے زندگی کے ان میدانوں میں تحقیق کرنے کے لیے، ان کو سمجھنے کے لیے، جن کے بارے میں ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ ہوشیاری سے پر

یہ منطقی من ہی سب کچھ نہیں ہے۔اس من سے ہٹ کر بھی کچھ ہے۔عظیم اور لامحدود،ایسا حسن جسے سمجھنا من کی صلاحیتوں سے باہر ہے۔اسی عظمت میں بے پناہ مسرت ہے،عیش ہے،اور اس حالت میں جینا اور اس کو محسوس کرنا ہی تعلیم کا راستہ ہے۔اگر آپ کو اس طرح کی تعلیم نہیں ملتی تو جب آپ دنیا میں داخل ہوں گے،آپ اس بھیانک طوائف الملوکی کو بنائے رکھیں گے جس کی تعمیر کئی پیڑھیوں نے پہلے سے کر رکھی ہے۔

اس لیے استادو اور طالب علمو! آپ اس بارے میں ضرور سوچیے۔شکایتیں کرنے کے بجائے ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار ہوں اور ایک ایسی جگہ کی تخلیق میں تعاون دیں جس میں مذہب کی صحیح معنوں میں تلاش کی جائے،اسے محبت کیا جائے،اس کے لیے کام کیا جائے،اسے جیا جائے۔اس کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ زندگی حیرت انگیز طریقے سے خوش حال ہوگئی ہے،جس کے سامنے دنیا کے تمام بینکوں کے اکاونٹ پھیکے ہیں۔

*****

سوال: انسان نے اتنا علم کس طرح حاصل کیا؟کس طرح اس نے اتنی مادی ترقی کی؟کہاں سے اسے اتنی عظیم قوتیں حاصل ہوئی؟

کرشن مورتی: انسان نے اتنا علم کس طرح حاصل کیا؟یہ کافی آسان ہے۔ آپ کچھ جانتے ہیں اور اسے اپنے بچوں تک پہنچا دیتے ہیں۔آپ کے بچے اس میں کچھ اور اضافہ کرتے ہیں اور اسے اپنے بچوں کے ہاتھوں میں سونپ دیتے ہیں اور یہ عمل یوں ہی جاری رہتا ہے۔ہم علم کو تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کرتے ہیں۔ہمارے اجداد یہ بالکل ہی نہیں جانتے تھے کہ آج کے ہوائی جہاز کیا ہیں،الیکٹرانک کا معجزہ کیا ہے، لیکن تجسس،ضرورت،جنگ،خوف اور لالچ نے اس علم کو کافی بڑھایا ہے۔

علم کے بارے میں ایک نرالی ہی بات ہے۔فرض کیجیے آپ کو بہت کچھ معلوم ہے،آپ کے پاس معلومات کا ذخیرہ ہے۔لیکن جو من علم سے پر ہے،جانکاری سے بوجھل ہے،وہ تلاش کے لیے قطعی نااہل ہے۔وہ بھلے ہی علم اور ہوشیاری کے توسط سے کسی ایجاد کا استعمال کر لےلیکن تلاش اپنے آپ میں ایک بنیادی چیز ہے جو علم سے متاثر نہیں ہوتی،جس سے من میں اچانک دھماکہ ہوتا ہے؛اور تلاش ایجاد کا اچانک دھماکہ ہی نہایت ضروری ہے۔بیشتر لوگ خاص طور پر اس ملک میں علم سے، روایت سے،عقاید سے اور اس خوف سے کہ والدین کیا کہیں گے،پڑوسی کیا کہیں گے،بری طرح سے دبے جا رہے ہیں۔ان کا ساری خود اعتمادی ہی برباد ہوگئی ہے۔وہ بے جان ہو گئے ہیں۔علم کا بوجھ سچ مچ ہمارے من کا مردہ بنا دیتا ہے۔علم ضرور کارآمد ہےلیکن یہ اس دوسری چیز کی غیر موجودگی میں انتہائی تباہ کن ہے اور آج کی دنیا میں واقع ہونے والے حادثات میں یہ دکھائی دے رہا ہے۔

آپ ذرا دیکھیے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔آج ہمارے پاس سبھی حیرت انگیز ایجادات ہیں،راڈار جو بہت دور اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کی اطلاع پہلے سے ہی دے دیتا ہے،آبدوزیں ہیں جو ایک بار بھی سمندر کے باہر اپنا منھ نکالنے بغیر ہی ساری دنیا کا چکر لگا لیتی ہیں،بات چیت کرنے کے حیرت انگیز ذرائع جن سے ہم ممبئی میں بیٹھے بیٹھے بنارس یا نیو یارک بات کر سکتے ہیں۔یہ سب علم کے نتائج ہیں۔لیکن ان سب کے باوجود کچھ ہے جو کہیں کھو گیا سا لگتا ہے؛اس اسی لیے علم کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔اسی لیے دنیا میں جنگیں ہیں،تباہی ہے،تکالیف ہیں اور لاتعداد لوگ بھوکوں مر رہے ہیں،انھیں صرف دن میں ایک بار یا اس سے بھی کم کھانا ملتا ہے اور آپ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔آپ تو صرف بنارس،دلی یا ممبئی کے کسی کونے میں بیٹھے ہوئے اپنی کتابوں،اپنی چھوٹے چھوٹے

مسائل اور اپنے عیاشی کو جانتے ہیں۔ دیکھیے، ہم بھلے ہی بے پناہ علم حاصل کرلیں لیکن اس 'دوسری چیز' کے بغیر جس کے ذریعے انسان جیتا ہے، جس میں مسرت ہے، آرام ہے، خوش حالی ہے، انتہائی شادمانی ہے، ہم اپنی ہی تباہی کرنے جارہے ہیں۔

مادی سطح پر بھی وہی بات ہے۔ انسان نے دھیرے دھیرے مادی ترقی کی ہے، لیکن وہ عظیم توانائی انسان کو کہاں حاصل ہورہی ہے؟ ہر میدان میں کام کرنے والے موجد، محقق، کھوجی میں توانائی اپنی انتہائی شکل میں ضرور رہی ہوگی۔ لیکن ہم میں سے بیشتر لوگوں میں بہت ہی کم توانائی ہے۔ ہے نا؟ جب تک ہم چھوٹے رہتے ہیں ہم کھیلتے ہیں، موج کرتے ہیں، رقص کرتے ہیں، گاتے ہیں، لیکن جیسے ہم بڑے ہوجاتے ہیں، یہ توانائی جلد ہی برباد ہوجاتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا ہے؟ تب ہم گھروں کی تھکی ہاری بیویاں بن جاتے ہیں یا پھر ہم روزی روٹی کے لیے کسی دفتر میں روز بروز، ماہ در ماہ، کبھی نہ ختم ہونے والے بے رس گھڑیاں بتایا کرتے ہیں۔ تب ہم میں بہت ہی تھوڑی یا بالکل ہی توانائی نہیں رہ جاتی ہے۔ اگر ہم میں توانائی ہوتو ہوسکتا ہے کہ ہم اس سڑے ہوے سماج کو تباہ ہی نہ کرڈالیں، سارے نظم کو تہس نہس کرڈالیں۔ کہیں ہم ایسا کوئی کام نہ کربیٹھیں، اس لیے سماج یہی چاہتا ہے کہ ہم میں وہ توانائی ہی نہ ہو اور اس لیے وہ 'تعلیم'، روایت، نام نہاد دھرم اور تہذیب کے توسط سے بتدریج ہماری توانائی کو کچل ڈالتا ہے۔ صحیح تعلیم کا کام ہے ہماری اس روانائی کو بیدار کرنا اور اس میں دھماکہ لانا۔ اسے ابھارتے ہوے متحرک، تیز، مضبوط بنانا اور ساتھ ہی ساتھ اسے سادگی سے قابو میں کرکے اس سچ کی تلاش میں لگانا۔ تب یہ توانائی عظیم اور لامحدود ہوجاتی ہے۔ پھر یہ توانائی اور زیادہ تکلیف پیدا نہیں کرتی، بلکہ یہ خود میں نئے سماج کی تخلیق کرنے والی ہوتی ہے۔

میں جو کہہ رہا ہوں اسے آپ دھیان سے سنیں۔ اسے آپ ایک طرف نہ رکھ

دیں کیونکہ یہ سچ مچ نہایت اہم ہے۔ آپ اسے صرف قبول یا رد نہ کرلیں بلکہ آپ خود یہ معلوم کریں کہ آپ سے جو کہا جارہا ہے اس میں کتنی سچائی ہے۔ آپ لاپرواہ نہ ہوں۔ آپ یا تو 'گرم' بنیں یا 'سرد'۔ اگر آپ ان ساری باتوں کی سچائی کو محسوس کرتے ہیں اور اس سب کے بارے میں سچ مچ 'گرم' ہیں تو آپ کی یہ 'گرمی' یہ توانائی، خود بہتر ہوگی اور یہی ایک نئے سماج کے گھیروں میں ہی انقلاب کرکے خود کو کمزور نہیں کرے گی، جو کہ جیل کی دیواروں کو سجانے جیسا عمل ہوگا۔

اس لیے خاص طور پر تعلیم کے میدان میں ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی توانائی ہے، اسے ہم کس طرح بنائے رکھ سکیں، اور کس طرح اسے اور زیادہ زندہ اور دھماکہ خیز بنا سکیں۔ اس کے لیے بہت زیادہ ذہانت اور سمجھ کی ضرورت ہے۔ اساتذہ طالب علموں کو ان کی تخلیقی توانائی کو بیدار کرنے میں مدد نہیں دے سکتے، کیونکہ خود ان میں ہی بہت کم توانائی ہے، وہ خود معلومات کے بوجھ تلے دبے ہوے ہیں اور اپنے مسائل میں ڈوبے ہوے ہیں۔ اس لیے ان تمام باتوں کا جتنا تعلق اساتذہ سے ہے، اتنا ہی تعلق طالب علموں سے بھی ہے۔

سوالی: جب میں اپنے والدین سے یہ کہتا ہوں کہ میں دوسرا مذہب قبول کرنا چاہتے ہوں تو وہ ناراض کیوں ہوجاتے ہیں؟

کرشن مورتی: پہلی بات تو یہ ہے کہ انھیں اپنے دھرم کی لالچ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کا دھرم دنیا کا اکلوتا دھرم بھلے نہ ہو، لیکن وہ سب سے اچھا ضرور ہے۔ اس لیے وہ شاید یہی چاہتے ہیں کہ آپ بھی اسی دھرم کو مانیں۔ اس سے آگے وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ بھی ان کے سوچنے کے خاص طریقے سے، ان کے فرقے سے، ان کی ذات سے اور ان کے درجے سے چپکے رہیں۔ یہی کچھ سبب ہیں اور یہ بھی کہ اگر آپ

دوسرے دھرم کو ماننے والے بنیں گے تو آپ ایک جھنجھٹ کھڑی کر دیں گے، خاندان کو اس سے دقتیں آئیں گی۔

لیکن اگر آپ نے ایک منظم دھرم کو چھوڑ کر دوسرا دھرم قبول کر بھی لیا تو بھی کیا ہوگا؟ کیا اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا کہ آپ ایک جیل سے دوسری جیل میں چلے گئے ہیں؟ دیکھیے، جب تک آپ کا من کسی عقیدے میں اٹکا ہوا ہے، تب تک وہ جیل ہی میں ہے۔ اگر آپ ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوے ہیں اور آپ عیسائی بن جاتے ہیں، تو آپ کے والدین ناراض ہو سکتے ہیں لیکن یہ ایک معمولی بات ہے۔ اہم بات تو یہ محسوس کرنا ہے کہ آپ کسی بھی دھرم کے ماننے والے بن کر صرف پرانی روایات کی جگہ پر نئی طرح کی روایات کو اپنا رہے ہیں۔ اس سے بھلے ہی آپ نسبتاً کچھ زیادہ پرجوش اور کچھ زیادہ 'یہ' یا 'وہ' بن جائیں لیکن پھر بھی آپ کسی یقین، کسی عقیدے کی گرفت میں ہی ہیں۔

اس لیے آپ اپنا دھرم نہ بدلیں، جو جیل کے اندر کی بغاوت جیسا ہی ہے، بلکہ آپ تو اس جیل کی دیواروں کو مسمار کریں اور خود تلاش کریں کہ حق کیا ہے، خدا کیا ہے۔ اور سچ مچ اسی کا مطلب ہے اور اسی سے آپ کو انتہائی بیداری اور توانائی حاصل ہوگی۔ لیکن ایک جیل سے دوسری جیل میں جانا اور اس بات کے لیے لڑنا کہ کون سی جیل زیادہ اچھی ہے، ایک بچے کے کھیل سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

عقاید کے قید خانوں کو توڑنے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے ایک بالغ من کی، ایک مفکر من کی اور ایک ایسے من کی جو خود قید خانے کے مزاج کو سمجھتا ہو اور ایک قید خانے کا موازنہ دوسرے قید خانے سے نہیں کرتا ہے۔ کسی چیز کو سمجھنے کے لیے آپ کو اس کا موازنہ کسی دوسری چیز سے کرنے کی ضرورت نہیں

ہے۔ موازنہ سے سمجھ نہیں آتی بلکہ خود اس چیز کے سیدھے تجزیے سے ہی سمجھ کی آمد ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ منظم دھرموں کے مزاج کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تمام دھرم یقینی طور پر ایک جیسے ہی ہوتے ہیں، پھر چاہے وہ ہندو ہو، یا بودھ دھرم ہو یا عیسائی یا اسلام دھرم ہو یا پھر وہ کمیونزم ہو جو دھرم کا ایک جدید روپ ہے۔ جس لمحے آپ اس جیل کو سمجھ لیتے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ آپ اس کی تمام روایات، سرگرمیوں اور پروہتوں کے اقوال اور اس میں پوشیدہ مفاہیم کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں تو پھر آپ کا کبھی کسی دھرم سے کوئی مطلب ہی نہیں رہے گا، کیونکہ صرف وہی شخص، جو عقاید سے آزاد ہے، اس کا پتہ لگا پائے گا جو تمام عقاید سے ہٹ کر ہے۔

سوال: کردارسازی کا صحیح راستہ کون سا ہے؟

کرشن مورتی: یقینی طور پر اچھے کردار کے ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ ناحق سے دور رہیں اور آپ میں حق کے ساتھ رہنے کی صلاحیت ہو۔ لیکن کردارسازی مشکل کام ہے۔ کیونکہ ہم میں سے بیشتر لوگوں کے لیے ہم خود کیا سوچتے ہیں اسے تلاش کرنے کے مقابلے وہ زیادہ اہم ہوتا ہے جو ہمیں کتابوں، اساتذہ، والدین اور سرکار کے ذریعے بتایا جاتا ہے۔ اس لیے اس بات سے متاثر ہوے بغیر کہ اس سے تکلیفیں آئیں گی یا خوشی حاصل ہوگی، اپنے لیے خود سوچنا اور حق کی تلاش کرنا اور اس حق پر مضبوطی سے ثابت قدم رہنا، اسی کا نام کردارسازی ہے۔

مثال کے طور پر، مان لیجیے، آپ جنگ میں یقین نہیں رکھتے۔ اس لیے نہیں کیونکہ کسی مصلح نے یا کسی مذہبی رہنما نے آپ کو ایسا کہا ہے، بلکہ اس لیے کہ آپ نے خود اپنے لیے اس بارے میں غور و فکر کیا ہے، آپ نے خود اس بات کا پتہ لگایا ہے، اس کی گہرائی میں آپ اترے ہیں، اس پر فکر کی ہے اور آپ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ قتل

کسی بھی شکل میں غلط ہے۔ پھر وہ قتل کھانے کے لیے کیا گیا ہو، یا نفرت کی وجہ سے یا اس نام نہاد وطن سے محبت کے لیے۔ اب اگر آپ اس حق کو گہرائی سے محسوس کرتے ہیں اور ہر حالت میں اس پر ثابت قدم رہتے ہیں، بھلے ہی اس کے لیے جیل جانا پڑے یا گولی کھانی پڑے، جیسا کہ کسی کسی ملک میں ہوتا ہے، تب آپ حقیقت میں با کردار ہوں گے۔ تب آپ کے لیے کردار کا مطلب سماج کے ذریعے بتایا گیا کردار نہیں ہوگا بلکہ اس سے بالکل ہی مختلف معنی میں ہوگا۔

لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کی اس سمت میں حوصلہ افزائی ہی نہیں کی جاتی۔ حق کی تلاش، اسے دیکھنے، تھامنے اور ناحق کو چھوڑ دینے کی وہ طاقت، وہ بیداری نہ تو استاد میں دکھائی دیتی ہے اور نہ طالب علم میں ہی، لیکن اگر آپ یہ کر سکتے ہیں تو آپ کسی سیاسی رہنما یا مذہبی گرو کی تقلید نہیں کریں گے، کیونکہ آپ تب خود اپنے لیے روشنی ہوں گے۔ اور صرف اسی وقت نہیں جب آپ چھوٹے ہیں بلکہ پوری زندگی اس روشنی کی تلاش کرنا اور اس کی پرورش کرنا ہی تعلیم ہے۔

سوالی: خدا کی تلاش میں عمر کس طرح رکاوٹ بنتی ہے؟

کرشن مورتی: عمر کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ ان برسوں کے اعداد ہیں جتنے آپ نے جیے ہیں؟ یہ عمر کا ایک حصہ ہے۔ آپ فلاں فلاں سال میں پیدا ہوئے اور آج آپ پندرہ یا چالیس یا ساٹھ سال کے ہیں۔ آپ کا جسم کمزور ہوتا جاتا ہے اور یہی بات آپ کے من کے ساتھ بھی ہوتی ہے جب وہ زندگی کے تمام تجربوں، دکھوں اور تفکرات سے بوجھل رہتا ہے اور ایسا من کبھی حق کی تلاش نہیں کر سکتا۔ من تبھی کھوج کر سکتا ہے جب وہ جوان ہو، نیا ہو، سادہ ہو۔ لیکن اس سادگی کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سادگی کا تعلق صرف بچپن سے ہی نہیں ہے؛ ہو سکتا ہے، بچہ سادگی پسند نہ بھی ہو۔ سادہ من تو

ایک ایسا من ہے جو تجربوں کی باقیات کو جمع نہ کرتے ہوئے تجربے سے گذر رہا ہوتا ہے۔ من محسوس ضرور کرے اور یہ ضروری بھی ہے۔ من ہر چیز کے لیے بیدار ہو۔ ندی اور بیمار جانور کے لیے، جلانے کے لیے لے جائے جاتے ہوئے لاش اور بھاری بوجھ ڈھوتے ہوئے غریب دیہاتی کے لیے، زندگی کی تکلیفوں اور مظالم کے لیے، ورنہ تو یہ مردہ ہے۔ تجربوں سے بندھے بغیر ہی من کو جواب دینے کا اہل ہونا چاہیے۔ ہماری روایات، ہمارے تجربوں کا ذخیرہ اور ہماری یادداشت کی راکھ ہی ہمارے من کو پرانا بناتی ہے۔ وہ من جو روزانہ کل کی یادوں کے لیے، ماضی کے تمام خوشیوں اور دکھوں کے لیے خالی ہو جاتا ہے، وہی من نیا ہے، تازہ ہے، سادہ ہے، اس کی کوئی عمر نہیں ہوتی اور اس سادگی کے بغیر آپ خدا کی تلاش نہیں کر سکتے، پھر چاہے آپ دس برس کے ہوں یا ساٹھ برس کے۔